تبصرے

علمِ تفسیر اور مفسّرین :

ڈاکٹر رشید احمد (جالندھری) ایم-اے از ہر، پی ایچ ڈی کیمبرج کی یہ کتاب اُن کے انگریزی مقالے بعنوان "قرآن اور صوفی ادب بالخصوص امام ابو القاسم قشیری" کے ایک حصے کا اُردو ترجمہ ہے لیکن مصنف نے اس اُردو ترجمے میں بعض مباحث کا اضافہ کیا ہے۔ اور بعض اُمور پر نظر ثانی کی ہے، اس طرح زیرِ نظر کتاب محض ترجمہ نہیں رہی بلکہ اس کی حیثیت ایک مستقل تصنیف کی ہوگئی ہے ہمارے خیال میں اس موضوع پر اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں علمِ تفسیر اور تفسیری ادب بالخصوص شروع کے دَور کے متصوفانہ تفسیری ادب کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں فاضل مصنف نے بنیادی مسائل کو لیا ہے اور کوشش کی ہے کہ ایجاز کے باوجود کوئی اہم مسئلہ رہ نہ جائے۔

پہلے پہل قرآن کی تفسیر کی ضرورت کیوں پڑی؟ مصنف نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے :

"گو قرآن کے اوّلین مخاطب عرب تھے اور ان کی مادری زبان عربی تھی، لیکن ہر عرب کے لیے عربی زبان کے کسی شاہکار کو بغیر صحیح ذہنی استعداد کے سمجھنا کافی مشکل ہے۔ قرآن کے اولین مخاطب اپنی ذہنی استعداد میں فطری تفاوت کی بنا پر ایک ہی درجے پر قرآن کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ جب کبھی ان کو ضرورت پیش آتی وہ رسول اللہ صلعم سے قرآن کی وضاحت کرنے کی درخواست کرتے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب روزہ کے شروع وقت کے بارے میں یہ آیت "حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ" (۲: ۱۸۷) نازل ہوئی تو عدی بن حاتم نے اس کے لفظی معنے لیے اور اس میں جو محاورہ استعمال ہوا تھا، وہ ان کی نظروں سے اوجھل رہا۔ چنانچہ انھوں نے اس خیال سے ایک سفید اور ایک کالا دھاگا لیا کہ جب روزے کا وقت شروع ہوگا تو ان کا رنگ تبدیل ہو جائے گا اور اس سے وہ معلوم کرلیں گے کہ روزے کا وقت شروع ہوگیا ہے۔ بہر حال رسول اللہ صلعم نے انھیں بتا دیا کہ یہ تو ایک محاورہ ہے، اور اس سے مراد صبح کی پو پھٹنے کے ہیں۔

مجھے چند برس قاہرہ میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور میرا یہ ذاتی تجربہ ہے۔ اچھے خاصے تعلیم یافتہ عرب دوست بھی قرآن سنتے لیکن اسے ٹھیک طرح سمجھ نہ پاتے۔ یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلعم کے بعض صحابہ ایسے تھے کہ وہ قرآن سنتے تو اسے سمجھ لیتے تھے لیکن عام صحابہ کو تفسیر کی ضرورت پڑتی تھی جس کی مدد سے وہ قرآن کو صحیح سمجھ سکتے تھے۔ اگر صحابہ کو باوجود آپؐ کے اس قدر قریب ترین ہونے کے تفسیر کی ضرورت تھی تو ہمیں تو اس کی یقیناً اُن سے کہیں زیادہ ضرورت ہے"۔

بقول مصنف قرآن مجید کی جملہ تفسیروں کو دو انواع میں تقسیم کیا گیا ہے: ایک تفسیر بالروایت اور دوسری تفسیر بالرائے ـــ تفسیر بالروایت کے سلسلے میں عیسائی اور یہودی روایات جنھیں اسرائیلیات کا نام دیا گیا ہے تفسیر القرآن میں داخل ہو گئیں اور تفسیر بالرائے کے تحت وہ افکار و معتقدات جو یونانی و ایرانی علوم کے تحت مسلمانوں میں پیدا ہو گئے تھے، ان کی بحثیں تفسیر کا حصّہ بن گئیں۔ اس معاملے میں ڈاکٹر صاحب نے بالکل ٹھیک لکھا ہے۔ "قرآن کی روح کو بے نقاب کرنے کے لیے قرآن کے طالب علموں کو اس کے چہرے سے ان سب پردوں کو ہٹانا چاہیے۔ اور ان سماجی و مذہبی احوال و کوائف کا مطالعہ کرنا چاہیے، جن میں قرآن کا نزول ہوا"۔ مصنف کہتے ہیں: "عہدِ گزشتہ میں اور اس دور میں بھی بعض علما اس مکتبِ خیال کے حامی رہے ہیں"۔ یہاں ضمناً موصوف نے یہ بحث کی ہے کہ آیا قرآن کا کسی دوسری دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جائز ہے یا نہیں۔ ایک عرصہ تک عربوں اور ترکوں میں قرآن کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنا ممنوع سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس کے خلاف مصنف نے ترجمہ کے جواز میں متقدمین کے اقوال نقل کیے ہیں ـــ مصنف کے نزدیک تفسیر کے آخذ میں سب سے پہلا ماخذ تو خود قرآن ہے کیونکہ جیساکہ مروی ہے، قرآن کے بعض حصّے اس کے دوسرے حصوں کی تفسیر کرتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن کی تشریح و تعبیر کے سلسلے میں رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مروی روایات ہیں۔ اس میں شک نہیں، جیساکہ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ تفسیر کے بارے میں اگر رسول اللہ صلعم کی کوئی صحیح حدیث ہم تک پہنچتی ہے تو ہمیں اسے قرآن کی تفسیر کے طور پر لازماً تسلیم کر لینا چاہیے لیکن وہ اور امام زرکشی اس ضمن میں یہ تصریح بھی کرتے ہیں کہ تفسیر کے متعلق جو روایات بالعموم بیان کی جاتی ہیں، ان میں سے اکثر موضوع ہیں۔ اور جو صحیح ہیں، وہ بہت کم ہیں۔ اسی سلسلے میں امام احمد بن حنبل کا یہ قول بھی مشہور ہے کہ تفسیر القرآن کی روایات کی کوئی بنیاد نہیں۔

تفسیر بالرائے کے باب کے تحت مصنف لکھتے ہیں کہ جہاں تفسیر بالروایت کے قائل قرآن کی تفسیر میں "رائے" یا عقل سے کام لینے کے بالکل خلاف ہیں۔ وہاں تفسیر بالرائے کے حامی تفسیری روایات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ خود امام غزالی نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تفسیری روایات کی تضعیف کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "اگر تفسیر بالروایت کے حامی یہ دعوے کرتے ہیں کہ تفسیر کی بنیاد روایات ہونی چاہئیں نہ کہ "استنباط" اور "شخصی رائے" تو اس صورت میں انھیں تفسیر کے معاملے میں ابن عباس اور ابن مسعود کے اقوال قبول نہیں کرنے چاہئیں۔ کیونکہ یہ اقوال براہ راست رسول اللہ صلعم سے ماخوذ نہیں"۔ بہر حال امام غزالی نے تفسیر القرآن میں "رائے" اور عقل کے استعمال پر بہت زور دیا ہے اور لکھا ہے کہ محض تفسیر بالروایت کو کوئی بڑا علمی کارنامہ نہیں سمجھنا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں ایک بڑی دلچسپ بحث اٹھائی ہے۔ ہمارے صوفی مفسروں نے بعد میں اپنی تفسیروں میں بہت سے ایسے افکار بھی شامل کر لیے، جو فرقہ باطنیہ سے ملتے ہیں۔ اس صورت میں آخر ان میں اور باطنی اہلِ قلم میں کیا فرق رہا۔ اس بارے میں موصوف نے شرح العقائد از عطاء الہ کا جو اقتباس دیا ہے، وہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

"یہ واضح رہے کہ صوفیا کلام اللہ اور احادیث نبوی کی جو عجیب و غریب تعبیریں کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ قرآن اور احادیث کے وہ معانی نہیں جو بظاہر ان کے الفاظ سے نکلتے ہیں۔ بے شک آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے ظاہری معانی وہی ہوتے ہیں جو ان سے لغوی طور پر اور سیاق و سباق سے نکلتے ہیں لیکن آیات و احادیث کے اس کے علاوہ باطنی معانی بھی ہوتے ہیں، جنھیں ایک صوفی جس کا اللہ سے تعلق ہوتا ہے سمجھتا ہے۔ ایک حدیث ہے کہ ہر آیت کے ایک ظاہری معنی ہیں اور ایک باطنی۔ تم اس آدمی کی دلیل آرائی سے بچو جو تمھیں یہ کہہ کر باطنی معنی معلوم کرنے سے روکتا ہے کہ اس سے قرآن اور احادیث کے مفہوم اصلی سے انحراف ہوتا ہے۔ دراصل مفہوم اصلی سے انحراف تو اس وقت ہوتا۔ اگر صوفیہ کہتے کہ آیات اور احادیث کے صرف یہی معانی ہیں۔ اس کے برعکس وہ ان کے ظاہری معانی تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ اس پر مستزاد وہ ان کے وہ معانی بھی لیتے ہیں، جو اللہ کی طرف سے ان پر القا ہوتے ہیں"۔

کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے صوفیہ کی اشاری یا رموزی تفاسیر کی تائید میں امام غزالی کی رائے نقل کی ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ ایک آیت کا اشاری یا رموزی مفہوم جو ایک صوفی کے دل پر وارد ہوتا ہے، اسے

مسترد نہیں کرنا چاہیے۔ اس بارے میں ایک مثالی موقف تو یہ ہے کہ ایک آیت کے ظاہری و باطنی معنی میں توازن رکھا جائے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ یہ صوفیہ کی خوش قسمتی تھی کہ امام غزالی ان کی صفوں میں شامل ہو گئے اور انھوں نے اشاری یا رموزی تفسیر القرآن کے موضوع پر ایک بلند پایہ کتاب لکھی۔

صوفی مفسروں کے ذیل میں ابن عربی کا نام بھی بڑا نمایاں ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے قرآن کی ایک متصوفانہ تفسیر لکھی تھی، جو نہیں ملتی۔ اب ان کی متصوفانہ تفسیر کے لیے ان کی دو کتابوں "فتوحات مکیہ" اور "فصوص الحکم" کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں ابنِ عربی کی ان تفسیری کوششوں پر تفصیلی بحث ہے اور انھوں نے اپنے فلسفیانہ خیالات بالخصوص اپنے مسلکِ وحدت الوجود کی تائید کے لیے آیاتِ قرآنی سے جو عجیب و غریب معانی اخذ کیے ہیں۔ ان کا بیان ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی تصوف کی اساس اسلام کی وہ تعلیمات ہیں، جن میں ایک طرف اخلاق پر زور ہے اور دوسری طرف عرفانِ الٰہی کو مذہب کی اصل روح بتایا گیا ہے۔ لیکن جب اسلامی تصوف بطور ایک علم کے مدون ہوا، تو قدرتی طور پر اس میں وہ سب افکار و خیالات داخل ہو گئے جو اُس ماحول میں عام تھے۔ جہاں اس تصوف کو نشو و نما ملی۔ چنانچہ جب صوفیہ نے قرآن کی تفسیریں لکھیں تو دوسری قوموں کے تصوف کے افکار بھی اُن میں آ گئے، یہ براہ راست آئے یا اخوان الصفا اور اس جیسے دوسرے باطنیہ کے علمی اداروں کے ذریعہ آئے، یہ سوال الگ ہے لیکن ان کا ماخذ وہی تھا۔

بد قسمتی سے ہمارے ہاں ایک عرصے سے تصوف کے علمی و فکری و تاریخی پہلوؤں سے بے توجہی برتی جاتی ہے اور خاص طور سے متصوفانہ تفسیر پر تو شاید ہی کسی نے لکھا ہے اور یوں بھی عہدِ جدید میں ہماری علمی و فکری زندگی پر "صوفی" کے مقابلے میں "مولوی" کو غلبہ حاصل رہا ہے۔ اور "باطن" کو نظر انداز اور "ظاہر" کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے۔ کاش ہم آج امام غزالی کے اس قول کو اپنا مطمحِ نظر بنائیں جس میں انھوں نے ظاہر و باطن میں توازن رکھنے کی تلقین فرمائی ہے۔

امید ہے ڈاکٹر رشید احمد صاحب کی یہ کتاب تصوف کو علوم دینی میں اس کا صحیح مقام دلوانے میں مشعلِ راہ ثابت ہو گی اور اس سے ہمارے ہاں صوفیائے کرام کی تفسیری تصانیف کو شائع کرنے کی طرف توجہ ہو گی۔ کتاب نہایت ہی خوشنما ٹائپ میں چھپی ہے۔ کاغذ عمدہ اور جلد معیاری ہے۔ آخر میں بڑے مفید حواشی ہیں۔ اشاریہ اور کتابیات بھی ہیں۔ آخر میں اس موضوع پر اردو میں یہ پہلی اور نہایت ہی مفید کتاب شائع کرنے پر مکتبہ علمیہ کو ہم مبارک باد دیتے ہیں۔

ناشر: مکتبہ علمیہ، ۱۵۔ لیک روڈ۔ لاہور